سب جرم ہمارے نکلے

رُخسانہ نگار عدنان

۱۸ ستمبر ۱۹۹۹ء

آج کا دن بھی کتنا عجیب و غریب سا تھا۔ خیر کوئی ایسا عجیب بھی نہیں تھا اور غریب تو بالکل بھی نہیں تھا۔ سب ہی نے اچھے اچھے اور قیمتی ملبوسات زیب تن کر رکھے تھے۔ اس لیے اس دن کو غریب کہنا تو زیادتی ہوگا' ہاں البتہ تھوڑا عجیب سا ضرور تھا' وہ بھی شاید فقط میرے لیے یا شاید اس کے لیے بھی۔ ویسے بھی انسان کی زندگی میں دو ہی دن اہم ہوتے ہیں یا تو اس کی پیدائش کا دن یا اس کی موت کا دن۔ مگر دونوں دن اس کی پوزیشن اتنی آکورڈ سی ہوتی ہے کہ وہ انہیں سیلیبریٹ بھی نہیں کر سکتا۔ ورنہ تو شاید دنیا میں ہر وقت واویلا سا مچا رہتا۔ لوگ آنے کے گیت اور جانے کے نوحے گاتے رہتے۔ ہر وقت ایک شور سا برپا رہتا۔

او ہو بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ بات ہو رہی تھی آج کے دن کی۔ چونکہ انسان پیدائش اور موت کے دن کو (بذات خود) منا نہیں سکتا۔ یہ فریضہ اس کے چاہنے والے حسب توفیق بخوبی انجام دے دیتے ہیں۔ اس لیے اس نے بیچ کے کچھ دن نکال لیے جیسے سالگرہ کا دن۔ حالانکہ شعور میں آکر اس دن کی خوشی منانا جو آج کے دن سے کئی سالوں کے فاصلے پر ہے۔ انتہائی احمقانہ حرکت ہے۔

اس کے بعد اہمیت کا حامل دوسرا دن ہوتا ہے جس میں وہ انسان شعوری طور پر ایک نئی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ یعنی شادی کا دن۔ ویسے یہ شادی شدہ بھی کیسا عجیب ہے۔ شادی۔ یعنی خوشی اور شدہ۔ یعنی ختم شدہ۔ یعنی شادی کے بعد ہر خوشی کا اینڈ ہو جاتا ہے۔ اور رہتا بھی یہی ہے۔ مگر آج کا دن شادی کا دن بھی تو نہیں تھا' بس بیچ میں لٹکا ہوا نکاح یعنی نہ ادھر کے نہ ادھر کے۔ صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں۔ بس حلفاً" اقرار اس طبعی تبدیلی کا جو اس کی زندگی میں آنے والی ہے۔ کم از کم لڑکیاں تو ضرور بمعہ نام کے بدل جاتی ہیں۔ جیسے میں آج سے ضحیٰ وقار کے بجائے ضحیٰ عادل ہو گئی۔ کتنی بڑی تبدیلی ہے۔ ایک انقلاب سید کی سادی سی زندگی میں برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس وقت یہ انقلاب یوں برا محسوس نہیں ہو رہا

ناولٹ

کیونکہ میں اس وقت اپنے کمرے میں اپنے بستر پر بیٹھی آرام سے ڈائری لکھ رہی ہوں۔

حالانکہ اس تبدیلی کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ امی، ابو اور ماموں، ممانی کے درمیان زبانی وعدے وعید تو پہلے سے ہو چکے تھے۔ مگر جونہی عادل صاحب بمشکل انجینئر بن کر اعلا پوسٹ پر فائز ہوئے، سمجھو خاندان کی لڑکیوں کے لیے نینڈر عمل گیا۔ خاندان کی ہر چھوٹی بڑی تقریب میں ماموں ممانی کی شرکت ناگزیر ہونے لگی۔ چلو ایک شہر کا معاملہ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ بندہ جیسی خوشی دعوتیں اڑاتا رہے۔ آدھے سے زیادہ خاندان تو لاہور میں آباد ہے۔ اب ماموں ممانی تو گویا پنڈی اور لاہور کے درمیان گھن چکر بن کر رہ گئے۔ دعوت نامے اتنے خلوص اور اصرار سے دیے جاتے کہ بے چارے مارے مروت کے انکار بھی نہ کر پاتے۔ دوسرے شہر کا معاملہ تھا۔ ایک دن میں تو آنا جانا تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اس لیے ان کی رات کی میزبانی کا شرف حاصل کرنے کے لیے میزبان اور دوسرے مدعوین کے درمیان کھینچا تانی شروع ہو جاتی۔ ماموں جان کا دل جس کے گھر میں اٹکا ہوتا۔ وہ اصرار کرتے تو میزبان جو خفا ہوتا سو ہوتا، دوسرے عزیز بھی برا مان جاتے کہ احسان صاحب انہیں اس قابل نہیں سمجھتے۔ پھر ناراضگیاں شروع ہو جاتیں۔

ماموں بے چارے بڑے گھبرائے۔ ایک دن ممانی سے الجھ بیٹھے۔ ان کا بی پی بڑھا ہوا تھا۔ وہ تو پریشان ہی ہو گئے کہ ایک مہینے میں یہ نواں چکر تھا۔ ممانی الگ پریشان تھیں۔ دونوں نے مل بیٹھ کر اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب شاخسانہ عادل کی وجہ سے ہے اور جب انہوں نے غور کیا تو خیال آیا۔ جتنے بھی گھروں میں دعوتیں ہوتی ہیں۔ ان سب میں دو دو تین تین لڑکیاں موجود ہیں۔ مگر جوان بھی ہوئی۔ انہوں نے سوچا کہ بات صاف ہو جانی چاہیے۔ وہ کسی کو جھوٹی امید نہیں دلانا چاہتے تھے۔ انہوں نے فوراً امی ابو سے رابطہ کیا۔ انہیں

صورت حال کی سنگینی کا احساس دلایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ ابھی تو حنا آپی کی شادی کو سال ہوا تھا۔ اتنی جلدی وہ دوبارہ کیسے شادی کا خرچ اٹھا سکتے تھے۔ ابو کی تنخواہ میں تو بس سفید پوشی کا بھرم ہی رکھا جا سکتا تھا۔ شادی جیسا لگژری خرچا سال میں دوبارہ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ بس پھر صلاح مشورے سے بات نکاح پر آ کر ٹکی۔ اور آج وہ فریضہ بھی ادا ہو گیا اور سارے خاندان کے دلوں پر جو گزری، یہ الگ الگ کہانی ہے۔

ماموں پہلے تو ادھر ہی ہوتے تھے لاہور میں۔ دونوں گھروں میں بہت آنا جانا تھا۔ ابو کی احسان ماموں سے بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ صرف عادل ہی نہیں آتے تھے۔ کیونکہ وہ شروع ہی سے کراچی میں اپنے ماموں کے پاس رہتے تھے۔ اس لیے بہت کم آتے تھے۔ پھر ماموں کا ٹرانسفر پنڈی ہو گیا تو بھی رابطے منقطع نہیں ہو سکے۔ ہاں صرف میں ان کی طرف بہت کم جاتی تھی۔ کہیں آنے جانے کے معاملے میں میرے ساتھ بڑی بے انصافی ہوتی رہی ہے۔ جو لاڈ پیار بڑے اور چھوٹے بچے کے حصے میں آتا ہے، اسے دیکھ کر سوچتی ہوں کہ درمیان والے بچے کو تو ہونا ہی نہیں چاہیے۔

حنا آپی اس معاملے میں بڑی خود پسند تھیں۔ "اب تینوں جائیں گی۔ پھر تم دونوں چلی جاؤ، میں نہیں جاتی۔" یہ کہتے ہوئے وہ آرام سے بیٹھ جاتیں اور ایسا ہمیشہ تب ہوتا تھا جب میں بھی کہیں جانے کے لیے تیار ہوتی۔ ثنا چھوٹی ہونے کی وجہ سے ضدی تھی۔ میں بڑے آرام سے پیچھے ہٹ جاتی کہ چلو میں نہیں جاتی اور جو لاڈ تو ویسے ہی اٹھتے ہوتے کا خوب فائدہ اٹھاتی۔ سو یہ تینوں جیسے ہی اسکول و کالج میں چھٹیاں ہوتیں، ماموں یا پھوپھو کی طرف نکل جاتے اور مجھے امی ہمیشہ گھر میں چھوڑ جاتیں۔ کیونکہ بقول ان کے مجھ میں احساس ذمہ داری ان دونوں سے زیادہ ہے۔ جہاں لاڈ پیار کی گنجائش نہ نکلتی ہو وہاں احساس ذمہ داری ہی پیدا ہوتا تھا۔

پہلے میں ہی گھر میں ابو کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس سے ماموں ممانی کو گمان گزرا کہ میں بہت سلجھی ہوئی، سمجھ دار اور فرماں بردار بچی ہوں۔ اس لیے انہوں نے بہت

شروع ہی سے امی ابو کے کانوں میں یہ بات ڈال رکھی تھی اور عادل کی اس بارے میں کیا رائے تھی۔ مجھے معلوم نہیں اور ویسے بھی کافی سالوں سے میں نے انہیں دیکھا نہیں تو ملاقات یا گفتگو کا کیا سوال۔ جس سے ان کے خیالات کا پتا چلتا۔ پہلے تو مجھے یہ شک بھی تھا کہ شاید انہیں میری صورت بھی یاد نہ ہو۔ پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے، کسی خاندان کی تقریب میں انہوں نے دیکھا ہو۔ ایسے مواقع پر مردوں کا اور کام ہی کیا ہوتا ہے۔ وہ کون سا جبر ہونے دیتے ہیں کہ کسی پر نظر۔ ویسے تو آپی بتا رہی تھیں کہ ان کے ماموں کی اکلوتی بیٹی بہت خوبصورت ہے اور پھر شروع کا ان کا ساتھ ہے (یہ بات بڑی پریشانی کی ہے) خیر ہو گی خوبصورت۔ اتنی حسین ہوتی تو آج وہ اتنے گواہوں کے سامنے میرے لیے اقرار کیوں کرتے بھلا۔ ساس اور ان کے رویے سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ مجبوری کے عالم میں بیٹھے ہیں۔

اوفوہ! نیند بھی نہیں آ رہی۔ پتا نہیں یہ مصیبت میرے ساتھ ہی کیوں ہے۔ جس روز تھکن زیادہ ہو جاتی ہے، میری تو آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے۔ لاکھ سر پٹخو اور یہ آنکھوں سے دور ہوتی جاتی ہے۔ یہ ثنا کو دیکھو کیا تکیے کو پیار کر آرام سے سو رہی ہے۔

ہاں آرام سے یاد آیا۔ آج کا دن بڑا تکلیف دہ تھا۔ سب کو نکاح کے جوڑے کی فکر تھی۔ وہ اعلا ہونا چاہیے۔ میں نے کتنی بار دبے دبے لفظوں میں بازار جانے کی آپی سے کہا کہ میرے پاس کوئی ڈھنگ کا جوتا نہیں ہے۔ آپی کہنے لگیں۔ "تم کون سا رخصت ہو کر جانا ہے۔ ثنا کا یا میرا پہن لینا۔" ان کی نیت ہی نہیں تھی جوتا خریدنے کی۔ وہی ہوا جب آخری وقت پر میں بار لے تیار ہو کر نکلنے لگی تو بے چاری بیوٹیشن کہنے لگی۔ "دلہن کا جوتا تو بدل دو۔" اور آپی ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔ "اوہ! وہ تو ہم بھول ہی گئے۔ چلو صحنی تم یہ میرے کوٹ شوز پہن لو۔ کون دیکھتا ہے۔ میں تمہاری سینڈل پہن لیتی ہوں۔" غصہ تو بہت آیا مگر بولنے کا مقام نہیں تھا۔ اس لیے چپ چاپ پہن لیے۔ گاڑی سے شادی ہال تک تو خیر رہی مگر جیسے ہی نکاح کے بعد

مجھے باہر عادل کے ساتھ بٹھانے کے لیے لے جانے لگے۔ اچھا خاصا فاصلہ تھا کمرے سے ہال تک کا۔ بس جوتے نے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیے۔ ثنا سے دبی دبی آواز میں کہا مگر وہ تو اس وقت مجھے کوئی تصور کیے ہوئے تھی۔ اور میرا بازو اتنی زور سے دبوچ رکھا تھا جیسے مجھے راستہ نہیں دکھ رہا۔ اسٹیج تک پہنچتے پہنچتے میرا برا حال ہو گیا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے جھٹکے سے اپنا بازو اس سے چھڑایا اور تیز قدموں سے آگے کی طرف بڑھی۔ ثنا بوکھلا گئی کہ شاید میں دولہا سے ملنے کو بہت بے تاب ہو رہی ہوں۔ اس لیے بھاگی جا رہی ہوں۔ ہاں اگر واقعی یہ نشست ہوتی تو جتنی تکلیف اس وقت میں سہہ رہی تھی۔ میں دولہا سے بھی پہلے گاڑی میں جا بیٹھتی۔ مگر کسی کو کیا احساس؟ آپی نے صوفے پر بیٹھتے ہی میرے اتنی زور کی چٹکی کاٹی کہ بس میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بھی میں نے پی لیے۔

صوفے پر بیٹھتے ہی میری پہلی کوشش یہ تھی کہ اس منحوس جوتے سے نجات حاصل کی جائے۔ مگر وہ خبیث مووی والا میری کوششوں پہ پانی پھیر رہا تھا۔ میں جوں ہی سائڈ سے ہاتھ نیچے لے جا کر پھنسے ہوئے جوتے کو نکالنے کی کوشش کرتی۔ وہ فوراً بول پڑتا۔ "پلیز اپنے ہاتھ پیروں کے اوپر رکھیں۔" اس کے کہتے ہی دولہا سمیت سب میری طرف متوجہ ہو جاتے۔ دو بار کی ناکام کوشش کے بعد میں نے ہمت ہار دی۔ سب کی نظروں کا بار بار سامنا کرنا تو اس تکلیف سے بھی مشکل تھا۔ اور جتنی تکلیف اس وقت میرے چہرے پر رقم تھی۔ اور جیسی فلم بنی ہو گی۔ جو بھی مووی دیکھے گا، وہ یہی کہے گا کہ میرے ساتھ یقیناً زبردستی کی گئی تھی۔

پھر سب مجھے وہاں بٹھا کر جیسے اٹھانا ہی بھول گئے۔ تکلیف کی وجہ سے میں بے چین تھی۔ بس پہلو بدلتی رہی۔ بے چارے عادل صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ مجھے کھٹمل کاٹ رہے ہیں۔ مروت کے مارے وہ بھی چپ رہے۔ صحیح کہتے ہیں کہ تکلیف کی گھڑیاں بڑی طویل ہوتی ہیں۔ دونوں پاؤں زخمی ہو گئے۔

صورت۔ "وہ [illegible] اپنی [illegible] تم سے کامیاب ہونے پر خود کو داد دے رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ابو! آپ پھوپھو سے بات کر لیں۔ پھر مجھے بتا دیجیے گا۔ ابھی میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ رمشا سے کہہ دیجیے گا کہ چائے وہیں بھجوا دے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ اس کا کام ہو گیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد زکیہ بیگم نے اس کی پیکنگ کروائی۔

"صبح کتنے بجے نکلو گے تم؟" انہوں نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔

"نماز کے فوراً بعد۔ کیونکہ بارہ بجے سے پہلے مجھے وہاں رپورٹ کرنی ہے۔" اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں تمہیں اٹھا دوں گی۔ اب تم سو جاؤ۔ کوئی کتاب پڑھنے نہ بیٹھ جانا۔" کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئیں۔

"پتا نہیں کبھی کبھی مجھے [illegible] ہے؟" وہ دل ہی دل میں [illegible] ہونے لگا۔ اب میں تو وہ جا کر پوچھوں۔ وہ کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ [illegible] ساری [illegible] اگر [illegible] تو ایک [illegible] جانے کا موقع [illegible] جائے گا [illegible] تھا۔ تین دن رہنا [illegible] شاید کوئی سرا ہاتھ آ جائے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں میں [illegible] تو بھول ہی گئی۔ تمہارے [illegible] شاہ [illegible] کو فون کیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئیں [illegible] کہنے لگیں کوئی حرج نہیں۔ [illegible] میرا [illegible] ہے [illegible] بھیجا [illegible] میں [illegible] ہوں۔" [illegible] ہوئیں۔ تو وہ خوش ہو گیا۔

"اب تم [illegible] بیٹا [illegible] سلام [illegible] صبح جلدی اٹھنا ہے۔" انہوں نے لائٹ بند کی اور باہر نکل گئیں۔ [illegible] مطمئن ہو کر [illegible] لیٹ گیا۔

——*

آج اسے [illegible] تیسرا دن تھا اور آج شام وہ واپس بھی [illegible] سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پھوپھو اس قدر [illegible] ہوں گی۔ کھانا اگرچہ وہ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا تھا اور اکثر دیر تک بیٹھ کر پھوپھا جان اور ہواد سے گپ شپ بھی لڑاتا۔ اور مزاج کے برخلاف پھوپھو اور ثنا سے لمبی لمبی باتیں بھی کرتا مگر اس مووی والی بے چینی و بے قراری لڑکی کی اسے ایک جھلک دکھائی نہ دی تھی۔ وہ تو لگتا تھا اسے دیکھ کر کسی [illegible] میں [illegible] ہو گئی تھی۔ اسے کوفت سی ہونے لگی۔ [illegible] تجسس اور جوش اس کے اندر [illegible] آنے سے پہلے تھا اب دم توڑنے لگا۔ تین بار تو [illegible] آتی کہ ثنا سے ہی کہہ دے کہ شاید ملاقات کی کوئی صورت نکل آئے۔ اگرچہ ثنا نے اشاروں میں اس [illegible] آفر بھی کی تھی مگر ملاقات سے اس کا مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو کچھ ایسا جاننا چاہتا تھا۔ جس سے اس کی مرضی کا [illegible] چل سکتا۔ اور اگر ثنا ملوا بھی دیتی تو اس نے [illegible] سامنا کرنا تھا۔ جبکہ وہ تو اچانک اس کے سامنے جا کر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر کیا کیا جائے۔ وہ صبح سے کمرے میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا۔ آج تو [illegible] جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہواد اسے [illegible] آیا تو اس نے کہہ دیا کہ ابھی [illegible] کیا فائدہ [illegible] اتنی مار ماری کرتے [illegible]

وہ خود سے کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہو گیا۔ [illegible] نیچے جھانکنے لگا۔ کھڑکی کا رخ [illegible] کے پچھلے گیٹ کی طرف تھا۔ جو کہ شاید بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ گیٹ سے دوسری طرف [illegible] سڑک کی طرف تھا۔ وہ بے زاری سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں آواز پڑی۔

"ہاں ہاں [illegible] ثنا [illegible] میں [illegible] تم [illegible] تو ادھر جاؤ۔" آواز ثنا کی تھی۔ وہ [illegible] تجسس سا ہو کر ذرا [illegible] کر نیچے جھانکنے لگا [illegible] کے شیشے سے [illegible] کر پچھلے گیٹ کی طرف بڑھی۔ اس کے بالوں کی لمبی چوٹی [illegible] کالی [illegible] کے سادہ سوٹ میں وہ [illegible] اس کے ایک ہاتھ میں گفٹ پیک اور شاپر تھا اس نے [illegible] دروازہ

کھولا تو باہر بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا کھڑا تھا۔

"یہ گفٹ پیک ہے اور یہ خط۔ دونوں چیزیں خاور کو دینا۔ اگر اس کی امی یا بہن آئے تو ان سے کہہ دینا کہ تمہیں خاور سے کام ہے۔ سن لیا؟ اسی کے ہاتھوں میں دینا یہ دونوں چیزیں۔ کہنا صحن آپی نے بھیجی ہیں۔ باقی باتیں میں اس سے فون پر کر لوں گی۔" اس نے گفٹ شاپر میں ڈال کر اسے دیا۔

"جی اچھا!" وہ سعادت مندی سے بولا۔

"اچھا اب تم جاؤ۔ میں شام کو خود ہی پتا کر لوں گی۔ تم نے [illegible] میرے خیال میں ثنا آ رہی ہے۔" اس نے کہہ کر جلدی سے دروازہ بند کیا اور مڑ کر تیز تیز قدموں سے اندر چلی گئی۔

"یہ کیا تھا؟" وہ پریشان ہو گیا۔ "خاور... یہ خاور کون ہے؟ ہمارے خاندان میں تو کوئی اس نام کا بندہ نہیں۔" وہ سوچنے لگا۔ اور ہواد نے اسے بتایا تھا بلکہ شاید کل ہی ذکر کیا تھا کہ یہ گیٹ وہ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ جتنے چوری چھپے کے کام ہوتے تھے وہ اسی چور دروازے سے کیا کرتے تھے۔ امی ابو سے چھپا کر کوئی مووی لے کر آنا۔ یا گرمیوں کی دوپہروں میں دوستوں کو بلا کر پارٹی اڑانے کا چوری چھپے ارینجمنٹ یہیں سے ہوتا تھا۔

تو اس کا کیا مطلب ہے۔ گفٹ پیک اور خط۔ صرف خاور کے لیے۔ پچھلا دروازہ اور ثنا سے چوری۔ عادل کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ یونہی تو میرا دل بے چین نہیں تھا۔ یہ سب جاننے کے لیے۔ یقیناً کوئی بات ضرور تھی تب ہی تو اس نے اتنی رونے والی شکل بنا رکھی تھی نکاح والے دن۔

اگر یہ سچ ہے تو... اف میرے خدا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"یہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ مجھے خیانت سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ چاہے وہ نظر کی ہو۔ مال کی ہو یا عزت کی۔ میں نے خود کو ساری زندگی [illegible] کر رکھا۔ ضبطِ نفس اور اپنے کردار کا احترام مجھے ہمیشہ ہر چیز سے زیادہ عزیز تر رہا۔ میں نے کبھی کسی کی چیز پر بری نظر رکھی اور نہ اپنی چیز پر کسی کو بری نظر ڈالنے دی۔ اور اب میرے ساتھ کیا ہوا۔ جب میں ماموں کے ہاں شروع شروع میں رہنے کے لیے گیا تو ابو نے میرے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ کسی کو میرے لیے منتخب کر چکے ہیں۔ اگرچہ ان کی یہ اجارہ داری اپنے وجود پر مجھے اچھی نہیں لگی تھی مگر پھر بھی میں نے ان کی زبان کے لیے خود کو پابند کر لیا۔ وحشت کے ساتھ رہتے ہوئے بڑے بڑے ایمان والے ڈول جاتے ہیں۔ میں اس پل صراط سے بھی بچ بچا کر گزر آیا کہ میرے باپ کے قول کو آنچ نہ آئے۔ اولاد کچھ عرصے آنکھوں سے اوجھل رہے تو والدین کا اعتماد اس پر کم ہو جاتا ہے۔ ابو کی آنکھوں میں ہر لمحہ اسی کمی کی پرچھائیں دیکھ کر فیصلہ کیا تھا کہ میں ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ اور اب جو میرے پندار کو ٹھیس لگی ہے۔ اس کی تلافی کون کرے گا۔

"اس لڑکی کے لیے میں نے خود کو ضبط کی بھٹی سے گزارا۔ اس لڑکی کے لیے۔" اس نے طیش میں آ کر کرسی کو ٹھوکر ماری۔

"جو ماں باپ کے سامنے ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔ اتنے اہم رشتے کے ہوتے ہوئے ادھر ادھر منہ مار رہی ہے۔ او مائی گاڈ۔" کتنی دیر وہ آنکھیں بند کیے جیسے غصے کو پیتا رہا۔

پھر اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ سامان پیک کیا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ پھوپھو اسے سیڑھیوں کے پاس ہی مل گئیں۔

"ارے بیٹا! میں ادھر ہی آ رہی تھی تمہارا پتا کرنے۔ میں نے کہا پتا نہیں کیا بات ہو گئی کہ تم ابھی تک نیچے نہیں اترے۔ میں خود پتا کر آؤں۔" اسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

"جی بس میں آ ہی رہا تھا۔ وہ ذرا سا سامان پیک کرنے میں تھوڑا ٹائم لگ گیا۔" اسے اپنی آواز بھی دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔

"ہیں! یہ تم نے سامان کیوں باندھ لیا؟" ان کی بیگ پر اب نظر پڑی۔ "تم نے تو شام کو جانا تھا۔" وہ حیرانی سے بولیں۔

"امی پھپھو! جانا تو شام کو ہی تھا۔ مگر آج آفس میں کام زیادہ ہے۔ اس لیے شام تو وہیں ہو جائے گی۔ پھر سامان لینے کوں گا تو زیادہ دیر ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے سوچا ایک بیگ ہی تو ہے۔ ساتھ لیے چلتا ہوں۔" اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نہیں۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے بیٹا! پھر تمہارے پھوپھا آئیں گے تو بہت خفا ہوں گے۔ تم ذرا ان سے مل کر تو جانا۔ اچھا صبح چلے جانا۔" وہ اصرار کرنے لگیں۔

"نہیں۔ صبح تو مجھے رپورٹ دینی ہے۔ جاکر۔ اس نے آپ پھوپھا جان کو بتا دیجیے گا۔ اور میرا سلام بھی کہہ دیجیے گا۔" وہ اٹھ کے کپڑے جھاڑنے لگا۔

"ہم چائے ناشتہ تو کر لو۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔"

"پھوپھو! مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں دفتر میں کچھ لے لوں گا۔"

"حد کرتے ہو عادل بیٹا! تم بھی۔ بھلا بھوک کیوں نہیں ہے۔ ساری رات معدہ مشقت کرتا ہے۔ صبح کو خالی پیٹ کام پر نہیں جانا چاہیے۔ چلو تم میرے ساتھ اندر اور یہ بیگ رکھ دو یا ہو سے۔ کہیں نہیں بھاگا جا رہا ہے۔" وہ ذرا خفگی سے بولیں تو اس نے بیگ سیڑھیوں کے پاس ہی رکھ دیا۔

اور شکستہ قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑا۔

♥_♥_♥

ذکیہ بیگم کو لگا کہ کون ہے۔ وہاں دفتر میں تھی آنکھیں کھولیں تو رات کی منزل بھی دور تھی

"کچھ محسوس کیا آپ نے جب سے عادل لاہور سے آیا ہے۔ چپ چپ سا ہے۔"

ذکیہ بیگم نے اخبار پڑھتے احسان صاحب کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" انہوں نے کچھ چونک کر پوچھا۔

"مطلب تو کوئی نہیں۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔ مجھے وہ کچھ کھویا کھویا سا لگتا ہے۔"

"چپ چپ، کھویا کھویا۔ کیا بات ہے بیگم! آج بڑے مرکبات سوجھ رہے ہیں آپ کو۔" وہ بولے۔

"ابھی دیکھو نوجوان جہان لڑکا ہے۔ پھر اپنی سسرال سے ہو کر آیا ہے۔ اسے واپس آئے میں کچھ دن تو لگیں گے نا۔" انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔ یہی بات ہے۔ ایک تو یہ لڑکا کسی سے کچھ کہتا بھی نہیں۔ بس جو بات پوچھو اسی کا جواب دے گا۔ جے زیادہ بولے گا تو اس کا ریکارڈ خراب ہو جائے گا۔" وہ جیسے خود سے ہی بڑبڑا رہی تھیں۔

"ہو جائے گا ٹھیک۔ شادی کے بعد تو بڑے بڑوں کے مزاج درست ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے پھر سے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں شادی سے یاد آیا۔ کل شام رمنا کی ساس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ اب وہ شادی کرنا چاہ رہی ہیں بیٹے کی۔ قاسم کی نوکری لگے کئی ماہ ہونے کو آ گئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اب اس کی شادی کر ہی دوں۔ تو میں نے کہہ دیا کہ آپ سے پوچھ کر بتاؤں گی۔" بات مکمل کر کے وہ جواب کا انتظار کرنے لگیں۔

"ہوں۔" وہ چپ ہو گئے۔

"پھر؟" وہ کچھ دیر بعد پھر بولیں۔

"پھر کیا؟ میرا تو خیال ہے۔ ٹھیک ہے کر دیتے ہیں۔ اور ساتھ میں عادل کی بھی۔ کیا خیال ہے؟" انہوں نے بیوی کی رائے مانگی۔

"بہت نیک خیال ہے۔ اور یوں بھی عادل کے نکاح کو بھی سوا سال سے اوپر ہونے کو آیا ہے۔ اب رخصتی کروا ہی لینی چاہیے۔ آپ شائستہ سے بات کر لیں تو پھر میں رمنا کی ساس سے بات کروں۔" وہ تو جیسے تیار بیٹھی تھیں۔

"السلام علیکم!" عادل نے اندر آتے ہوئے دونوں کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ کہاں تھے صاحبزادے۔ تم یہ تمہارا دفتر کیا اب رات گئے تک کھلا رہتا ہے۔" احسان صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے تنقیدی لہجے میں کہا۔

"وہ میں ایک دوست کی طرف چلا گیا تھا۔ بس وہیں دیر ہو گئی۔" وہ کچھ شرمندگی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کھانا لگاؤں تمہارے لیے؟" ذکیہ نے اس کے تھکے تھکے انداز کو دیکھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔ چائے کے ساتھ کافی کچھ لے لیا تھا۔" ذکیہ بیگم بچوں کے کھانے پینے کے معاملے میں بڑی حساس تھیں۔ اس نے ماں کی تسلی کے لیے کہا۔

"کیا بات ہے عادل! تم کچھ پریشان ہو۔" ماؤں کے اندر اللہ میاں نے پتا نہیں کون سا ٹرانسمیٹر فٹ کر رکھا ہوتا ہے۔ جو اولاد کی معمولی پریشانیوں کو بھی فوراً ریسیو کر لیتا ہے۔

"نہیں تو۔ میں کیوں ہونے لگا پریشان۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

"ہم ہم!" احسان صاحب نے ہنکارا بھر کر اس بیٹے کی جسی پیغام رسانی میں مداخلت کی۔ اور بیگم کو اشارا کیا کہ وہ بات چھیڑیں۔

"وہ عادل! رمنا کی ساس کا فون آیا تھا۔ شادی کے لیے کہہ رہی تھیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" اس نے کرسی سے پشت ٹکاتے ہوئے کہا۔

"ہم چاہ رہے ہیں، ساتھ ہی تمہارے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں تو اچھا ہے۔"

"امی! میرا ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔" وہ آرام سے بولا تو احسان صاحب جیسے بھڑک کر بولنے لگے۔ ذکیہ بیگم نے انہیں آنکھ کے اشارے سے روکا۔

"کیوں بیٹا! ایسی کیا بات ہے پھر نکاح کو بھی سوا سال ہو گیا ہے۔ تم ماشاءاللہ برسرروزگار ہو اور ضحیٰ کی بھی تعلیم مکمل ہو چکی ہے۔ وقار بھائی کو اتنا ہی وقفہ چاہیے تھا۔ سو وہ انہیں مل گیا۔ اب ہمیں اور دیر نہیں کرنی چاہیے۔" انہوں نے اس طرح سے بات کی کہ اس کے لیے کوئی عذر ہی نہ چھوڑا۔ وہ کچھ دیر چپ رہا پھر بولا۔

"دراصل میں امی! میرا ٹرانسفر کراچی ہو رہا ہے۔ میں اسی کو رکوانے کے چکر میں ہوں۔ اور اگر ٹرانسفر ہو گیا تو فوری طور پر میں یہ شادی وغیرہ افورڈ نہیں کر سکوں گا۔"

"مگر ٹرانسفر وغیرہ تو ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم ضروری کام التوا میں ڈال دیں۔" ذکیہ بیگم بولیں۔

"اور دیکھو صاحبزادے! تمہیں کچھ افورڈ نہیں کرنا پڑے گا۔ ہم کس لیے بیٹھے ہیں یہاں۔ اگر تمہارا ٹرانسفر ہو بھی جاتا ہے تو جب تک رہائش کا معقول انتظام نہیں ہو جاتا۔ ضحیٰ یہاں بڑے آرام سے رہ سکتی ہے۔" انہوں نے دو ٹوک بات کی۔

"مگر۔" اس نے بولنے کی کوشش کی۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس بیگم! تم رمنا کی ساس سے مل کر معاملات طے کر لو تو پھر میں شائستہ سے بات کرتا ہوں۔ اب یہ فرض جتنی جلدی ادا ہو جائے بہتر ہے۔"

یہ کہتے ہوئے احسان صاحب کمرے سے نکل گئے۔

عادل نے ماں کی طرف دیکھا تو وہ بھی نظریں چرا کر اٹھ کھڑی ہو گئیں۔

*_*_*

پھر اس نے کتنے ہاتھ پاؤں مارے اس شادی کو رکوانے کے لیے مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ احسان صاحب ویسے تو اپنے بچوں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھتے تھے مگر جس بات کو حق سمجھ کر ڈٹ جاتے تھے پھر انہیں اس سے کوئی نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس ضد میں انہوں نے اتنی جلدی کی تاریخ رکھی کہ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ عادل نے غصے میں آکر اپنا ٹرانسفر کراچی کرا لیا اور شادی سے پندرہ دن پہلے کراچی چلا گیا مگر انہوں نے پروا نہ کی بلکہ اسے وارننگ دی کہ اگر شادی سے دو دن پہلے وہ پنڈی نہ پہنچا تو وہ کراچی پہنچ جائیں گے اسے لینے اور پھر جس طرح اسے لے کر آئیں گے اس کی شکایت وہ پھر ان سے نہ کرے۔

اور عادل جانتا تھا کہ یہ دھمکی خالی خولی دھمکی نہیں، وہ اس پر عمل بھی کر گزریں گے اسی وجہ سے وہ شادی سے دو دن پہلے پہنچ گیا مگر اس کی ناراضگی اور فرسٹریشن

ستمگاری اس کے ہر ہر عمل سے ظاہر ہو رہی تھی مگر احسان صاحب نے بالکل توجہ نہ دی۔ انہیں پتا تھا کہ نکاح تو ہو چکا ہے اور رخصتی کرانے کے لیے وہ اسے کسی بھی وقت لے جا سکتے تھے۔ اب بچے رسموں سے باہر [illegible] کے درمیان [illegible] زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ ذکیہ بیگم تو [illegible] شوہر کو توجہ نہیں کر سکتی تھیں۔ کئی بار عادل کو بھی پیار سے سمجھا کر پوچھنے کی کوشش کی کہ آخر کیا بات ہے۔ وہ کیوں خوش نہیں ہے جبکہ نکاح انہوں نے اس کی خوشی اور رضامندی سے کیا تھا تو اب کیا بات ہو گئی۔

"میں نہیں کرنا چاہتا تھا ابھی شادی۔" وہ غصے سے بولا۔

"تب نہ ہوتی چھ ماہ بعد ہو جاتی۔ نہیں تو سال بعد ہو جاتی بیٹا! آخر تو کرنی ہی تھی پھر تم اتنا غصہ کیوں دکھا رہے ہو۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ "ایسی کیا بات ہو گئی۔ کیا تخی تمہیں پسند نہیں؟"

"نہیں! ایسی بات نہیں۔" "تو نکاح کے وقت بتا دیتے۔ اب عین وقت پر تمہاری حرکتیں میرے ساتھ پاؤں پھیلا رہی ہیں۔ تمہاری پریشانی مجھے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرنے دے رہی۔" وہ پریشانی سے بولیں۔

"میں کب آپ کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔ کسی نے میری بات نہیں مانی۔ مجھے کچھ وقت تو دیتے۔ آپ جانتی ہیں میں بلاوجہ ضد نہیں کیا کرتا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا تو انہیں لگا کہ ان کے دل کو اس کے لہجے پر کچھ ہونے لگا۔ واقعی اس نے کبھی بلاوجہ ضد کر کے انہیں پریشان نہیں کیا تھا تو اب کوئی وجہ ہو گی۔

"پھر میرے بچے! وجہ بتاؤ۔ میرے بس میں ہوئی تو میں کچھ کروں گی۔"

وہ ان کی طرف [illegible] نظر سے دیکھ کر رہ گیا۔ [illegible] وجہ کو تو میں اپنے آپ کے سامنے بھی نہیں [illegible] جانے [illegible] نصیب [illegible] آنکھوں [illegible] جب انسان [illegible]

میں کانٹے بونے پڑتے ہیں اور ان پر چلنا بھی پڑتا ہے۔ والدہ کی تقدیر" انسان جب اپنے زعم میں آتا ہے تو خدا بن بیٹھتا ہے اور اگر مات کھانے پر آئے تو سب ہتھیاروں کے ساتھ بھی مات کھا جاتا ہے اور اپنوں کی محبتیں ہی تو ہماری مات کا اہتمام کرتی ہیں اور نامراد ہو جانا ہے مقدر کا!

*_*_*

کہیں قرار نہ ہو اور کہیں خوشی نہ ملے
ہمارے بعد کسی کو بھی زندگی نہ ملے!
الٰہی نصیب کوئی اس سے بڑھ کے کیا ہو گا
جو اپنا گھر بھی جلا دے تو روشنی نہ ملے!

"ہائے تخی! تمہارے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔" رمنا نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

بارات ابھی کچھ دیر پہلے پہنچی تھی اور رمنا ہی اسے کمرے تک لے کر آئی تھی۔ کل اس کی شادی تھی اور وہ بارات کے ساتھ نہیں گئی تھی، جس کے غم میں وہ سارا دن روتی رہی تھی کہ بھائی کی شادی ہو اور بہن بارات کے ساتھ نہ جائے۔ اس کے نزدیک یہ اس صدی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ سارا دن تصور کی آنکھ سے دیکھتی رہی۔ اب بارات پہنچی ہو گی۔ اب تخی کی دلہن بنی ہو گی۔ وہ بلال کی رسم میں ثنا اور حنا آپی نے بھائی کو کتنا تنگ کیا ہو گا۔ رخصتی کے وقت تخی روئی ہو گی یا میک اپ کا خیال کر کے صرف آنکھیں پونچھتی رہی ہو گی۔ پھر جب تصور میں اس نے بارات کو رخصت کرا لیا تو فون کرنا شروع کر دیے۔ کہ کتنے بجے چلے تھے سب وہاں سے اور کتنے بجے تک پہنچیں گے۔ اس کے ساتھ گھر میں اس کی رشتے کی چچی تھیں جو اس کی بے قراری دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں اور کہتیں۔

"بہنوں کو بھابیاں لانے کا بڑا ارمان ہوتا ہے بس چار دن میں یہ ارمان ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔" اور وہ ہر بار [illegible] "خدا نہ کرے۔"

اور اب [illegible] کمرے میں بٹھا کر اس کا گھونگھٹ

اٹھا کر اسے جی بھر کے دیکھ رہی تھی جو [illegible] لگ رہی تھی۔ اس کی وارفتگی دیکھ کر اور بھی مجوب ہوئی جا رہی تھی۔

"عجیب ہے رمنا! تم نے کیا مجھے اپنی آنکھوں میں اتارنا ہے۔" وہ بول ہی اٹھی۔

"ہائے کاش میں اتار سکتی۔" وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔

"یہ کام جن کا ہے۔ تم ان کے لیے رہنے دو۔ کل تم اپنا بوریا بستر گول کرنے کی فکر کرو۔" بلال اندر داخل ہوتے ہوئے اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیا، تمہاری دلہن کو تو نہیں اتار رہی آنکھوں میں۔" وہ بلال سمیت سب سے خفا تھی روٹھے پن سے بولی۔

"تم ابھی کوشش بھی نہ کرنا۔ یہ نیک کام میں خود ہی کر لوں گا اور ذرا پرے ہٹ کر بیٹھو۔ کیسی بو سی چلی آ رہی ہیں تم سے۔ بیچاری تخی بھی کیا سوچتی ہو گی۔ ویسے کیا تم اس عید پر بھی نہیں نہائی تھیں۔" اس نے اس کے ماسیوں والے حلیے پر چوٹ کی۔

"ہاں تم تو کنویں کے مینڈک ہو۔ روز ہی نہاتے بھی ہو اور بے وجہ ٹرّاتے بھی ہو جبکہ میں تم سے بات نہیں کر رہی۔ تخی! تم ادھر ہو کر بیٹھ جاؤ۔" وہ مکمل طور پر بلال سے رخ پھیرے بیٹھی تھی۔

"ہاں بیچاری کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ ابھی پرسوں رو رو کے کہہ رہی تھیں۔ بلال! تم مجھے یاد کرو گے۔ میں نے کہا تم کون سا کالے پانی جا رہی ہو اسی شہر میں ہو۔ روز ہی آدھر کا کرو گی۔" وہ باز نہیں آیا۔

رمنا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ٹھیک ہے۔ میں نہیں آیا کروں گی۔ اب تو ترسو گے میری شکل کو۔" وہ روتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر جانے لگی۔ بلال نے اس کا بازو پکڑ کر اسے بٹھانے کی کوشش کی۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا رمنا! یقین کرو آج بھی سارے رستے تمہاری جدائی کے خیال نے میری آنکھیں خشک نہیں ہونے دیں۔ سب تخی کے رونے

دھونے کو بھول کر مجھے چپ کراتے رہے کہ [illegible] تمہارے بعد۔" اس نے مصنوعی ہچکی لی۔ "میرا کیا بنے گا۔ سوچتا ہوں تو جانو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ تمہارے آنے کے لیے منتیں مانا کروں گا اور جب تم گھر کی دہلیز پر قدم رنجہ فرماؤ گی تو میں ہار پھول لے کر تمہارا استقبال کروں گا جب بھی تو کبھی تمہیں جھک کر دست بستہ کھڑا ہو گا۔" اس نے مبالغہ آرائی کی حد کر دی۔

"ہاں پھر تمہیں "بے رحمی" والے بٹھانے آئیں گے۔" وہ تنک کر بولی۔

"بس کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔" ذکیہ بیگم اندر آتے ہوئے بولیں۔ "رمنا! تم تخی کا میک اپ ٹھیک کر دو۔ میں عادل کو بھیجتی ہوں اور بلال! تم نکلو یہاں سے اور باہر سے اپنے ابو کو بلا کر لاؤ۔ آرام کریں اب۔ صبح سے تھک گئے ہوں گے۔" انہوں نے آتے ہی بلال کو باہر روانہ کیا اور خود تخی کے پاس کھڑی ہو گئیں۔

"ماشاء اللہ نظر بد دور۔" انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔ "سدا خوش رہو آباد رہو۔"

کچھ دیر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہیں پھر باہر نکل گئیں۔

رمنا نے کٹ نکال کر اس کا میک اپ ٹھیک کیا۔

"ویسے تو میک اپ ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔ تم روئی نہیں تھیں؟" اس نے شرارت سے ذرا جھک کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ تخی اسے شکوے بھری نظر سے دیکھ کر رہ گئی۔

"رمنا! میرا دل دھڑک رہا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"بھئی! یہ تو اچھی بات ہے۔ میڈیکل سائنس کی رو سے دل کا کام ہی دھڑکنا ہے۔ ہاں اگر یہ نہ دھڑکتا تو تشویش کی بات تھی۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا میں اب چلتی ہوں اور آپ کے سرتاج کو بھیجتی ہوں۔ وہ آ کر تمہاری دھڑکنیں چیک کریں گے ویسے تو وہ طبیب نہیں مگر شاید تمہارے لیے کوئی دوا تجویز کر ہی دیں۔ اچھا آل دی بیسٹ شب بخیر۔" اس نے ذرا

ساتھ جھک کر اس کے ماتھے پر پیار کیا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔

اس نے گردن اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ بالکل سادگی سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ اس کا دل شاید سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگا جا رہا تھا۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی امتحان میں بیٹھی ہے اور ابھی ایگزامنر آئے گی اور زولوجی کا پیپر اس کے ہاتھ میں تھما دے گی۔ بی ایس سی کے امتحان میں سب سے زیادہ خوفزدہ اسی پیپر والے دن ہوئی تھی مگر آج تو اس سے بھی بدتر حالت ہو رہی تھی اس کی۔ یہیں تک سوچ پائی تھی کہ دروازے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ گردن جھکاتے ہوئے اور بھی سمٹ گئی۔ کسی نے اندر آ کر دروازہ بند کیا۔ اسے لگا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہے۔ اس نے نیچی نظروں سے دیکھا۔ آنے والا اندر آ کر کچھ دیر بیڈ سے ذرا فاصلے پر کھڑا رہا پھر بیڈ کے پائے کو زور سے ٹھوکر ماری اور الماری کی طرف چلا گیا۔ مارے خوف کے اس کا دل بند ہونے لگا۔ پھر شاید اس نے الماری سے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں چلا گیا۔ وہ دم سادھے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ اس نے پھر آنکھیں کھول کر نیچی نظروں سے کچھ لینے کی کوشش کی۔ پینٹ کے پائنچوں کی جگہ شلوار کے پائنچے اور بوٹوں کی جگہ سلیپروں نے لے لی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ "حقیقتاً" کچھ کہنے کے لیے الفاظ کا انتخاب ہو رہا ہے۔" اس نے قیاس کیا۔

"اس طرح بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔" الفاظ کی ادائیگی تیزی سے کی گئی تھی۔ آواز تو اچھی تھی مگر الفاظ۔ اسے یوں لگا جیسے ایگزامنر نے اندر آ کر کہا ہو کہ آج آپ کا زولوجی کا پیپر نہیں ہو گا۔

اس نے بیڈ سے تکیہ اور کمبل اٹھا کر صوفے پر پھینکے اور پھر منہ سر لپیٹ کر صوفے کی پشت کی طرف کروٹ بدل لی۔ وہ کچھ دیر یونہی ساکت بیٹھی رہی پھر اس نے آہستہ آہستہ اکڑی ہوئی گردن کو تھوڑا اوپر اٹھایا۔

اسے لگا جیسے وہ اس نوآموز بگلے کی طرح ہے جو پہلی بار اڑنے میں ہزار جھجکاہٹ کے بعد ذرا سی اڑان بھر کے اور بے یقینی کے عالم میں آہستہ آہستہ پر پھڑپھڑاتے ہوئے آنکھیں کھولتا ہے تو اس کی حیرانی کا عجیب ہی عالم ہوتا ہے۔ کچھ ایسی حالت اس وقت اس کی تھی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے آہستگی سے زیور اتارنے شروع کیے۔ رمنا اس سے کہہ گئی تھی کہ اس کے کپڑے واش روم میں لٹکے ہوئے ہیں۔ لہنگا سنبھالتے ہوئے وہ دھیرے سے نیچے اتری۔ اس کے گولڈن جوتوں کے ساتھ ہی چپل پڑی ہوئی تھی۔ باتھ روم میں جا کر اس نے چٹخنی اچھی طرح بند کی۔ دیوار پر لگے آئینے میں کچھ دیر اپنی صورت دیکھتی رہی۔

"ناحق بیوٹیشن کو اتنے پیسے دیے۔" اس نے دل میں سوچا۔ کپڑے بدل کر اس نے رگڑ رگڑ کر منہ دھویا تو دو تین آنسو بھی لڑھک آئے جنہیں اس نے بے دردی سے رگڑ ڈالا اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

بستر سے زیور اٹھا کر سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھے اور تکیے کی ٹیک بیڈ کے ساتھ لگا کر آرام سے بیٹھ گئی۔ اب کیا کروں۔ چونکہ اس نے منہ بھی کمبل میں دیے رکھا تھا اس لیے وہ خاصی نڈر ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اکڑوں بیٹھے بیٹھے وہ تھک گئی۔

"ثنا پتا نہیں کیا کر رہی ہو گی۔ سب کے سونے کا انتظام کر رہی ہو گی۔ آج تو وہ بہت تھک گئی ہو گی اس نے کبھی اتنا کام نہیں کیا۔" اس نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے اپنے گھر تک کا دوبارہ سفر کیا اور ثنا کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ اپنے آپ کو شاید یہ باور کرانا چاہ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ ایسا نہیں ہوا کہ وہ روئے دھوئے مگر پتا نہیں کہاں سے آنکھوں میں آنسو الڈ آئے تھے اس نے پھر آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"خود تو نواب صاحب کمبل لے کر لیٹ گئے۔ میں چاہے سردی میں اکڑ جاؤں۔" اس نے پھر دھیان بدلنے کی کوشش کی۔ "اس طرح تو رات نہیں گزرے گی۔ کیا کیا جائے کمرے میں کمبل کے علاوہ دوسرا کوئی لحاف بھی نہیں تھا اور اسے تو سردی بھی بہت لگتی تھی۔ وہ

ہمت کر کے آہستگی سے اٹھی اور بڑی احتیاط سے الماری کھولی تو اس کے نچلے حصے میں بیڈ شیٹس پڑی نظر آئیں۔ تین چادریں اس کے ہاتھ لگیں۔ اس نے تینوں کو جوڑ کر خیمہ سا بنا لیا اور نیم دراز ہو گئی۔ جیسے آج کی رات وہ اس کی چوکیداری پر مامور کی گئی ہو۔ تھکاوٹ کی وجہ سے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔

ایسا کیوں ہوا؟ اکثر کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے مگر ہیرو کوئی نہ کوئی معقول وجہ بتا کر یہ حرکت کرتا ہے مگر یہاں تو سب کچھ ہی الٹ ہوا تھا۔ یہ تو کوئی بھی وجہ بتائے بغیر سو گئے۔ ثنا ٹھیک کہتی تھی یہ کم بخت بند سے بڑی تہوں سے بنے ہوتے ہیں۔ ہر تہہ کے نیچے ایک اور تہہ۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

آنکھ کھلی تو دیکھا۔ وہ اس پر کمبل دے کر واپس لیٹ رہا تھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ کمبل سے گرمی کا احساس تو ہوا مگر ساتھ ہی چادروں کا خیال آیا۔ کوئی اندر آ گیا تو کیا کہے گا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر چادریں الماری میں رکھیں اور کمبل لپیٹ کر سو گئی۔

*_*_*

پھر ان کا ولیمہ بھی ہو گیا اور رمنا کی رخصتی بھی مگر ان کے درمیان پہلی رات سے سرد مہری کا جو گلیشیئر آیا تھا۔ اس کا پگھلنا اب محال نظر آ رہا تھا۔ عادل کا خیال تھا کہ وہ احتجاج کرے گی یا کم از کم روئے گی ضرور اور نہیں تو اس کی بے رخی کا تذکرہ ثنا یا رمنا سے ضرور کرے گی یا اپنی انسلٹ کی وجہ ضرور جاننا چاہے گی مگر منی نے اس کی توقع کے برخلاف ایسا کچھ نہ کیا بلکہ اسے لگا جیسے وہ اس ساری سچویشن کے لیے پہلے سے دعائیں مانگ رہی تھی جن کے پورے ہونے پر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

اس سے اس کا شک اور یقین میں بدل گیا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ پلٹ کر سبب ضرور پوچھے گی تو وہ صاف صاف بتا دے گا تو وہ خود ہی اپنی نظروں میں ذلیل و رسوا ہو جائے گی مگر اس نے بالکل اس کے برعکس رد عمل کیا تھا۔ سب کے ساتھ ہنسی خوب مطمئن ہو کر باتیں کرتی۔ احسان صاحب تو پہلے ہی بھانجی کے گرویدہ تھے۔ ذکیہ بیگم بھی اسے دیکھ کر نہال ہو جاتیں۔

بادیہ نے بڑے آرام سے اسے رمنا کی جگہ دے دی تھی اور بلال کے ساتھ وہ کرنٹ افیئرز سے لے کر پولیٹکس تک پر اتنے مزے سے بحث کرتی جیسے ان کے درمیان برسوں پرانی دوستی رہی ہو اور وہ ہمیشہ ہی سے اس گھر میں ایسے ہی رہتی آئی ہو جبکہ عادل کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ یوں بے تاثر ہو جاتا جیسے بازار سے گزرتے ہوئے کسی راہ گیر پر یونہی نظر پڑ جاتی ہے۔ اس کا دل جل کر خاک ہو جاتا یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

اس نے تیسرے دن ہی رخت سفر باندھ لیا اور سب کے روکنے کے باوجود اکیلا ہی کراچی چلا آیا۔ اس کی رہائش کے لیے اب تک دفتر سے گھر الاٹ ہو چکا تھا۔ ایک ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ اس طرح اس کی زندگی ایک روٹین کے تحت گزرنے لگی۔ ایک مہینہ تو یونہی سکون سے گزر گیا جیسے اس نے سب کچھ بھلا دیا ہو۔ اس دوران گھر والوں کے فون آتے رہے جوں ہی منی کے ہاتھ میں ریسیور دیا جاتا وہ رابطہ منقطع کر دیتا۔ جس سے اسے دلی تسکین حاصل ہوتی۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ اس طرح تو منی بہت مزے میں ہے۔ وہ اپنے گھر سے اٹھ کر اپنے ہی گھر آ گئی ہے اور جس کی وجہ سے آئی ہے اس کی اسے رتی برابر بھی پروا نہیں اور اگر وہ ساری عمر بھی اس کی پروا نہیں کرے گا تو اسے کوئی فکر نہ ہو گی اور گھر والوں بلکہ سب کے سامنے وہی جھوٹا پڑے گا۔ منی کا سکون اسے بے سکون کر گیا۔ میں کانٹوں پر چلتا ہوا یہاں تک آیا ہوں اور وہ بے خبری کے جھولے جھولتی رہے بغیر کسی خوف و خدشے کے۔ ایسا تو وہ کبھی نہیں ہونے دے گا۔ بس یہ خیال آتے ہی اس نے دو دن کی چھٹی لی اور منی کو لینے پنڈی چلا آیا۔

پہلی رات اس نے مطالعے کے بہانے اسٹڈی میں

ی خوش ہو کر بولیں۔ احسان صاحب نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مطالعے میں غرق ہو گئے۔

وہ ذکیہ بیگم کے بستر کے کنارے پر ٹک گیا۔ وہ اس کے پاس ہی آ بیٹھیں۔

"کیا بات ہے، تم سوئے نہیں ابھی تک؟" انہوں نے رسمی سا سوال کیا۔

"ابھی نیند نہیں آ رہی۔"

"کیا بنا تمہارے گھر کی الاٹمنٹ کا؟"

"وہی بتانے آیا تھا امی! مجھے گھر مل گیا ہے۔" اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر؟" پھر سے آگے کی بات جیسے وہ اس کے منہ سے کہلوانا چاہ رہی تھیں۔

"پھر جو آپ کہیں۔" وہ بھی ڈھیٹ بن گیا۔

"ہاں تو مشکل کیا ہے۔ اب تم نجی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ سامان وغیرہ میں یہاں سے پہنچوا دوں گی۔"

احسان صاحب نے کتاب بند کرتے ہوئے ان کی مشکل حل کی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ یوں بھی سب لوگ باتیں کر رہے ہیں کہ نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر تم اکیلے ہی چل پڑے۔ نجی بھی کیا سوچتی ہوگی۔"

وہ کچھ تاسف سے بولیں حالانکہ اس کا دل چاہا کہہ دے کہ نجی اب اتنی بھی بچی نہیں ہے اور یوں بھی وہ بہت خوش ہے۔ وہ بھلا کیوں سوچنے لگی کل سے وہ شب سے ان کی محبتوں کے مظاہرے دیکھ رہا تھا۔

"تم لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرا کرو بیگم! اور یوں بھی وہ کوئی جہیز لدا کر تھوڑا ہی چھوڑ گیا تھا جیسے ہی گھر

بھائی جان کے بعد

ان کی خیر خبر لیتے رہا کرو۔" ذکیہ بیگم بولیں۔

"جی! ابھی تو فرصت ہی نہیں تھی۔ اب جا کر چکر لگاؤں گا۔ ایک تو نئے گھر کی مصروفیت تھی۔ دوسرے یہ گھر ماموں کے گھر سے کافی دور پڑتا ہے۔"

"دوری کا کیا ہے بیٹا! جتنا بڑھاتے جاؤ، بڑھتی جائے گی اور تمہارے پاس اللہ رکھے اپنی گاڑی ہے۔ گھنٹہ بھر میں جا کر ہو آؤ گے۔"

"تم اسے کون سے رستوں پر لگا رہی ہو بیگم؟" احسان صاحب زیرک آدمی تھے۔ "وہ ماں بیٹی وہیں پلی بڑھی ہیں، وہ اپنا خیال خود بڑا اچھا رکھ سکتی ہیں۔ ایک ہو تمہیں تو ان کے بھائی نے کہا نہیں تھا ان سے جمیل کی موت کے بعد۔ ان کے ساتھ لاہور چلیں۔ انہوں نے صاف جواب دے دیا تھا کہ انہیں اکیلے رہنے کی عادت ہے اور میری بیٹی بڑی نازک مزاج ہے۔ وہ کسی دوسرے کے گھر میں نہیں رہ سکتی اور روپے پیسے کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں۔ کیسی باتیں کی تھیں خاندان میں۔ جب انہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں تو ہم کیوں خوامخواہ مداخلت کریں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ سلمیٰ بھابی شروع ہی سے آزاد خیال ہیں۔ اسی طرح کی تربیت انہوں نے بیٹی کی کی ہے۔ سارا شہر گھوم آتی ہے گاڑی میں بیٹھ کر اور اماں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اسی آزادی سے ڈر کر تو میں نے اپنے مرحوم بھائی کو انکار کیا تھا ورنہ جیسی پری صورت اللہ نے اسے دیا ہے کون ماں نہ چاہے گی کہ وہ اس کی بہو بنے۔ پھر بھی بیٹا! تم خیر خبر لیتے رہنا، ماموں نے تمہیں بیٹا بنایا ہوا تھا۔" بھائی کی یاد میں وہ آبدیدہ ہو

گئیں۔

"میرا تو خیال ہے۔ اب صفی بھائی کو وحت کی شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ابھی دو ایک سے بچ کر ایک رشتہ آ رہا ہے اور وہ لڑکا تو اسا شخص نکل کر ٹھکرا رہی ہیں۔ کچھ اور عرصہ گزر گیا تو وقت کی دھول حسن کا سارا اثر چاٹ لے گی۔ ابھی [illegible] بڑی ہے۔" احسان صاحب نے صاف گوئی سے کہا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں میں صفی کو لے کر بیٹھ جاؤں؟ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں تو انہیں اس قسم کا مشورہ بالکل نہیں دے سکتی۔ وہ پہلے ہی خار کھائے بیٹھی ہیں۔ موقع ملتے ہی بغیر کسی مروت کے بولنے لگتی ہیں۔"

"تو بیٹے کو مشورہ دے رہی ہو کہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے جا رہا ہے۔"

"عجیب ہے آپ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔ میں نے ایک بات کی تھی۔" ذکیہ بیگم کو دامن چھڑانا مشکل نظر آ رہا تھا۔

"اچھا امی! میں اب سونے جا رہا ہوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے اور صبح آپ ذرا جلدی تیاری کروا دیجیے گا۔ میں کل شام تک کراچی پہنچ جانا چاہتا ہوں۔" وہ ان کی بحث کو طول پکڑتے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے بیٹے! تم تو ہر کام میں جلدی مچاتے ہو۔ ابھی کل آئے ہو اور کل جانے کی رٹ بھی لگا دی۔ ایک دن تو صبر کرو۔ اتنی جلدی تیاری کیسے ہو گی۔" وہ تیزی سے بولیں۔

"میری چھٹی نہیں بڑھ سکتی اور تیاری میں کون سے ہاتھی گھوڑے جوتنے ہیں۔ سارا سامان وہاں ہے بس ضرورت کا سامان ہی لے کر جانا ہو گا۔" وہ کچھ بیزاری سے کہنے لگا۔

"تم [illegible] بھی آتی [illegible] ہو گی جتنی تمہارے دفتر کی ہے۔ ایک دن بغیر اطلاع کے چھٹی کرا [illegible] تمہارا دفتر [illegible] جائے گا۔ ابھی مجھے نماز بھی پڑھنی ہے [illegible] آپ تیاری [illegible] پریشان [illegible]"

"بیگم! اپنا تو حق [illegible] ہے۔ تم اس [illegible] وہ اپنا سوٹ کیس تیار کر لے گی۔ بلکہ اگر کچھ سامان رہ جائے گا تو بلال بعد میں جا کر دے آئے گا اور تم اطمینان سے نماز پڑھ لو۔ خواہ مخواہ پریشان مت ہوا کرو۔" احسان صاحب کرسی سے اٹھ کر بستر کی طرف آتے ہوئے بولے۔

"میں بلال کے کمرے میں سونے لگا ہوں۔ صبح اس سے کہیں پیکنگ کر دے۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"اس سے کہیں؟" احسان صاحب نے زیر لب دہرایا۔ "یہ صفی کا نام کیوں نہیں لیتا جیسے وہ نامحرم ہو۔ بیگم! مجھے تمہارے بیٹے کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے۔ اس کے ذہن میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جس نے اس کو ابھار رکھا ہے۔ یہ مجھے خوش نہیں لگتا۔ نئی شادی والی بات دونوں میں ہی نہیں لگتی۔" احسان صاحب نے تجزیہ پیش کیا۔

"ریٹائرمنٹ کا ایک نقصان یہ ہوا ہے کہ آپ گھر کی دیواروں کو بھی شک کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ سارا دن گھر میں پڑے پڑے الٹی سیدھی باتیں سوچتے رہتے ہیں اور میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ہر وقت دلہن کی ہم بننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔" وہ بیٹے کا دفاع کرتے ہوئے بولیں۔

"اچھا تو ہم کیا چھوڑے تھے تو جو ان دنوں میں آپ کو دیکھ دیکھ کر جیتے اور مرتے تھے؟" وہ شرارت سے بولے۔

"تو نہیں تھی مجھے۔" وہ ان کے انداز پر جھینپتے ہوئے [illegible] ہو گئیں۔ "مگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ اسے لینے کبھی نہیں آتا اور پھر دونوں پہلے کبھی ملے بھی تو نہیں۔ آہستہ آہستہ ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو گی نا۔ جھجکتے ہیں ابھی میرے سے۔ اچھا ہے وہاں جا کر [illegible] کا موقع مل جائے گا۔ میں بھی اسی لیے تو جانے دے رہی ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ [illegible] یوں اچانک بہو کو جانے دینا بھلا [illegible] گھر کر اس کا تبادلہ

کی ایک [illegible] کوئی غلط [illegible] ہی ہے تو وہ اس کو [illegible] کی تہہ کھولتے ہوئے جائے نماز بچھائی اور اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی۔

*_*_*

صفی کو کراچی آ کر پتا چلا کہ اس کا یہ سفر اور یہ تو اس کی سزا کا باقاعدہ ایک حصہ ہے۔ وہ صبح صبح اصل [illegible] دفتر نکل جاتا اور شام کو گھر لوٹتا۔ یہ گھر سرکاری کالونی میں تھا جس کا آدھے سے زیادہ حصہ ابھی زیر تعمیر تھا۔ ایک دو گھر بن سکے تھے اور ان میں سے کسی بس دو چار میں ہی لوگ رہتے تھے اور وہ بھی اتنے فاصلے پر بنے ہوئے تھے کہ ہمسائیگی کا رشتہ بہرحال پیدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی لاتعلقی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ تو جیسے اسے یہاں لا کر بھول ہی گیا تھا کہ اس کے اپنے علاوہ بھی کوئی ذی نفس اس گھر میں رہتا ہے۔

ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ ایک ملازم تھا۔ اس کو بھی عادل نے یہ کہہ کر نکال دیا کہ کام ہی کتنا ہوتا ہے جو ملازم رکھا جائے اور واقعی کام ہوتا ہی کتنا تھا۔ اس کے بعد سارا دن وہ پاگلوں کی طرح گھر میں پھرتی۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ یکتائی خدا کو زیبا ہے۔ انسان تو انسانوں کے ساتھ ہی جچتا ہے۔ یوں تو انسان انفرادیت کا دیوانہ ہے۔ ہر جگہ خود کو ممتاز دیکھنا چاہتا ہے مگر یہ انفرادیت بھی وہ انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے حاصل کرنا چاہتا ہے نہ کہ دیواروں کے بیچ رہ کر۔

اس کی ذات کی مکمل نفی کرنے کے لیے شروع شروع میں عادل نے اپنے کام بھی خود کرنے چاہے۔ صبح صبح وہ صفی سے پہلے اٹھ جاتا۔ اپنے کپڑے پریس کرتا۔ جلدی جلدی کچا پکا ناشتہ تیار کرتا اور جس کی تیاری کے دوران دو بار اس کا ہاتھ بھی جل گیا اور اس کے ہاتھوں پر پڑے آبلے دیکھ کر اس کے کولیگز نے اس کا مذاق اڑایا کہ لگتا ہے تمہاری بیگم گھر میں تم سے ہی کام لیتی ہے۔ [illegible] ان سب پھرتیوں کے باوجود اسے دفتر سے دیر ہو جاتی۔ باس کی ڈانٹ کی کوفت الگ

[illegible] نقصان ہو رہا ہے تو پھر اس نے تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد ذہنی [illegible] اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

یا تو صفی کو اس کی حالت کی خبر نہ تھی یا وہ جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔

رات کو وہ کچن صاف کر کے اس کی لائٹیں بند کر کے باہر نکلی۔ کاریڈور کی لائٹ بند کر کے زیرو کا بلب جلایا۔ اس نے پنڈی سے آتے ہی اپنا سامان الگ کمرے میں سیٹ کر لیا تھا۔ وہ کافی دیر سے ٹی وی کے آگے بیٹھا بات کرنے کا موقع تلاش کر رہا تھا آخر جب وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو اس نے ہمت کر کے اسے پکار ہی لیا۔

"ذرا میری بات سنو ادھر آ کر۔" اس نے پیچھے سے آواز دے کر نظروں کا زاویہ پھر ٹی وی اسکرین کی طرف پھیر لیا۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی اور پھر دروازے میں آ کر بولی۔

"جی فرمائیے۔" اس کا لہجہ ہر قسم کی مروت سے مبرا تھا۔

"تم صبح کو جلدی نہیں اٹھ سکتیں؟" پتا نہیں کیوں وہ اس سے نظر ملا کر بات نہیں کر پاتا تھا۔

"آپ کو کیسے پتا ہے کہ میں صبح کو جلدی نہیں اٹھتی۔" اس نے الٹا چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے روز صبح کو دیر ہو جاتی ہے دفتر سے۔" زبان نے پھر ساتھ نہیں دیا کہ کہہ سکے اٹھ کر ناشتا بنا دیا کرو۔ سمجھدار ہو گی تو خود ہی سمجھ جائے گی اور اب تک تو اس نے خاصی سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا تھا۔

"آپ نے جو کپڑے پہننے ہوں۔ استری سٹینڈ پر رکھ دیجیے گا۔ میں پریس کر دوں گی۔"

"اور ناشتا۔" اس نے دل میں کہا۔ اتنی دیر میں وہ باہر نکل گئی۔

پھر اس کا معمول بن گیا۔ صبح کو نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔ پہلے وہ دوبارہ سو جاتی تھی۔ اب

تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔ تم پھر آجاؤ۔" اس کا لہجہ
منت بھرا تھا۔
"جس قفس میں مجھے جھونکا ہے۔ کیا وہاں سے واپسی کا بھی کوئی راستہ ہے؟" اس نے دوسرے ہاتھ سے آنسو صاف کیے۔
"اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟" اس نے بڑے حوصلے سے آواز کو متوازن بناتے ہوئے پوچھا۔
"بہتر ہیں اب۔ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔ ابو کے دفتر میں بھی کچھ مسئلہ ہو گیا تھا۔ کئی ماہ سے وہ بھی کافی پریشان ہیں میں نے دوبارہ فون کیا عادل بھائی ملے انھوں نے کہا کہ تم سو رہی ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ میری بات تم سے یاد سے کرا دیں۔ پتا نہیں وہ بھول گئے یا جان بوجھ کر یاد نہیں رکھا۔" ثنا کی پوری دلیلیں اسے ذرا متاثر نہ کر سکیں۔
"اچھا امی سے میری بات کراؤ۔"
"ہاں یہ لو بات کرو۔"
"شمی! میری بچی! کیسی ہو تم! مجھے کیا پتا تھا تمہیں بیاہ کر میں تمہاری صورت کو ترس جاؤں گی۔ بہن بھائیوں کی محبت میں ہم لوگ اپنے پیٹ سے دشمنی کر بیٹھتے ہیں۔ تم خوش تو ہو نا؟" ان کی محبت بھری بے قرار آواز سے اس کے سارے شکوے آنکھوں کے رستے پگھل پگھل کر گرنے لگے۔
"بولو بیٹا، شمی کچھ تو کہو۔" وہ مضطرب ہو کر بولیں۔
"میں رات سے بے کل ہوں میری بچی پریشان ہے۔ چند روز دونوں سے فون ڈیڈ پڑا تھا۔ آج ٹھیک ہوا۔ کچھ تو کہو شمی!؟"
"امی! میں ٹھیک ہوں۔" اس کی بھیگی بھیگی آواز سنائی دی۔

ہے ہر آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلے گی۔" لیکن شاید ان کے اندازے غلط ہو گئے تھے وہ اتنی بہادر نہیں تھی جو اسے تنہا سمندروں کے سفر پر بھیج دیا گیا تھا۔
"بیٹا! تمہاری ذکیہ ممانی بھی ہفتہ بھر اسپتال میں رہی ہیں۔ تمہیں عادل نے نہیں بتایا؟"
"نہیں۔" اس نے سارے حجاب اٹھا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جھوٹ نے اس کی روح میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔
"پتا نہیں باپ بیٹے میں کیا جھگڑا ہے جو اتنے مہینوں سے خاموشی چھائی ہوئی ہے دونوں طرف۔ بس تم حوصلہ کرنا۔ میرا رواں رواں تمہارے لیے دعا گو ہے۔" (کیا سب کو اس بات کی خبر ہے جس سے میں انجان ہوں۔)
"یہ لو ثنا سے بات کرو۔" انھوں نے ریسیور ثنا کو تھما دیا۔
"شمی! تمہارے خاور صاحب آج کل لاہور آئے ہوئے ہیں۔"
"کون؟" وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔
"خاور اور کون؟"
"اچھا خاور! امریکہ سے کب؟" وہ جوش سے بولی عین اسی وقت عادل نے کمرے میں قدم رکھا، خاور کے نام پر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔
"تم ملی نہیں اس سے؟" ثنا نے پوچھا۔
"میں کیسے مل سکتی ہوں تم تو جانتی ہو۔" وہ بے بسی سے بولی۔
"اچھا کب تک ہے وہ یہاں؟" اس نے پوچھا۔

بے قرار ہو کر پوچھا۔

"پوچھا میں کوشش کروں گی ویسے تو مشکل ہے۔ اس سے کہنا مجھ سے بات کرے۔ اسے میرا سلام کہنا۔ فون نمبر دے دینا میں بہت پریشان ہوں آج کل۔ کہہ دو گی۔" اس نے جیسے منت سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ ابو کو میرا سلام کہنا آپی نہیں آئیں؟"

"سب کو میرا سلام کہنا اور آپی سے کہنا میں اس کی شکل کو ترس گئی ہوں۔"

"پگلی! اب تو پتا نہیں کس کس کی شکل کو ترس گئی ہو۔ محبت میں ناکام ہونے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ہمیشہ کی تشنگی ان کا مقدر بنتی ہے" اس نے تلخی سے سوچا۔

عادل نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے اس کے آگے میز پر رکھی جس میں آملیٹ اور سلائس تھے۔

"کھاؤ۔" اس نے لٹھ مار انداز میں کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"مت کھاؤ۔ مجھے تو بھوک ہے۔" وہ کہتے ہوئے بیٹھ گیا۔ آملیٹ کو سلائس کے بیچ میں رکھا اور آرام سے کھانے لگا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور جب دروازے تک پہنچی تو اس نے پیچھے سے آواز دی۔

"تیاری کر لینا ہم صبح پنڈی جا رہے ہیں۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اسی طرح کھانے میں مگن تھا۔

"اور اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک کپ چائے کا بنا دو۔" اسی طرح بیٹھے اس نے آواز لگائی۔

"ڈھیٹ انسان۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں آ گئی کل سے فاقے نے حشر خراب کر دیا تھا امی اور ثنا سے بات کرنے کے بعد [illegible] اس کے بیمار کے حیلے سے اس کی بھوک جاگ اٹھی اس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور کچھ کھانے کے لیے فریج کھول لیا۔

*_*_*

وہ اگلے روز شام تک پنڈی پہنچ گئے۔ ممانی بیٹھی وہ بھی بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ اسے دیکھ کر رونے لگیں۔ وہ خود کون سا خوش تھی اسے بھی رونے کا موقع مل گیا۔ ممانی تو شاید اپنی بیماری سے گھبرا کر رو رہی تھیں مگر وہ ان کے بیٹے کے دیے ہوئے دکھوں پر بھی رو رہی تھی۔ ماموں نے آ کر ممانی کو اس سے الگ کیا اور عادل سامنے ٹی وی لاؤنج کی کھڑکی سے یہ منظر بہت آرام سے دیکھتا رہا جیسے یہ سین بھی ٹی وی پر چلتے ڈرامے کا حصہ ہو۔ اسے اور رونا آنے لگا۔ ہادیہ نے پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگایا۔ اس کے آنسو صاف کیے اور اس سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ یہی تو وہ محبتیں تھیں جن کی کمی نے اسے بھی کملا دیا تھا۔

کھانے کے بعد وہ ممانی کے کمرے میں ہی چلی گئی۔ ماموں شاید اسٹڈی میں تھے بلال اور عادل لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہادیہ اپنے کمرے میں پڑھنے چلی گئی۔ وہ ممانی کے ساتھ ان کے بستر پر بیٹھ گئی۔

"ممانی جان! کیا ہوا تھا آپ کو۔ اتنی کمزور ہو گئی ہیں۔" وہ پیار سے ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"اور تم نے اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں تمہارے سائے کا گمان ہو رہا ہے۔ مجھے عادل سے یہ امید نہیں تھی۔"

وہ ہنس پڑی۔ "انہوں نے کیا کیا ہے۔" ہائے رے بھولپن

"ابھی کچھ کیا ہی نہیں میری پھول سی بچی کو کانٹا کر کے لایا۔"

"کانٹے تو پھول کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ بس کبھی کبھی ہمیں نظر نہیں آتے۔"

"بس میری قسمت خراب میں نے عادل سے کہا کہ مدحت اور سلمیٰ بھابی کی خیر خبر رکھنا۔ وہ ان کی طرف تین چار بار گیا۔ انہوں نے سارے میں مشہور کر دیا کہ وہ تم سے خوش نہیں ہے اور بہت جلد دشمنوں کے منہ میں خاک تمہارے درمیان علیحدگی ہونے والی ہے۔ بس تمہارے ماموں جان مجھ پر برس پڑے کہ یہ مشورہ میں نے اسے دیا تھا۔ پھر ان کی عادل سے فون پر بحث ہو گئی۔ انہوں نے کہہ دیا کہ اگر اس نے گھر میں پھوٹ ڈالنے والی کوئی حرکت کی تو اس پر اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔ لیکن عادل مان کر ہی نہیں دیا۔ اپنے غصے میں نہ آتے تا کہ مدحت اور اس کے درمیان ایسا کوئی رشتہ بنتا۔ سلمیٰ بھابی تو ان کی تاریخ طے کیے بیٹھی تھیں۔ تمہارے ماموں کا تو جو حشر ہوا سو ہوا میرا بلڈ پریشر تک لو ہو گیا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ اس گھر میں تب ہی قدم رکھ سکتا ہے جب حنیٰ اس کے ساتھ ہوگی۔ اس نے اس کے بعد دو تین ماہ مکمل خاموشی اختیار کی ہوئی تھی پھر بھلا یقین نہ کرنے والی کون سی بات رہ جاتی ہے۔ بس پچھلے ہفتے میری طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروانا پڑا۔ ادھر شائستہ بھی ٹھیک نہیں تھی اس کے ہاں تک بھی بھنک پہنچ چکی تھی اور تمہارے ماموں اور میں تو شرمندگی کے مارے ان سے بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چپ سادھ کر بیٹھ گئے اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا۔ اللہ نے خود ہی اس کا دل موم کر دیا جو تمہیں وہ لے کر آ گیا۔" اسے سب کی خاموشی اور لاتعلقی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

"سلمیٰ کہہ رہی تھی وہ تمہیں منہ نہیں لگاتا اور پتا نہیں کیا کیا وہ اس کے لیے کرتی پھر رہی تھی۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ممانی جان! بے شک ہمارے درمیان بہت محبت نہیں مگر اعتماد ضرور ہے۔" عادل کے قدم دروازے کے باہر ہی تھم گئے۔ "مجھے تو ان پر پورا بھروسا ہے۔ دیکھیں ناں اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو سب سے پہلے مجھے محسوس ہوتی۔ عورت کی حس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ میں مدحت سے صرف ایک بار ملی ہوں اس کی کمپنی میں عادل جیسے مرد خوش تو ہو سکتے ہیں مگر اسے اپنا نہیں سکتے کیونکہ اس سے ان کی اپنی شخصیت کے دب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور مرد اس معاملے میں کبھی عورت کو اپر ہینڈ نہیں دے سکتا اور پھر اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ پہلے بھی یہ کام کر سکتے تھے جبکہ میں ابھی ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنی تھی۔ ممانی جان آپ حوصلہ رکھیں آپ کا خون آپ کو رسوا نہیں کر سکتا میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

کہ عادل کے کردار کے بارے میں وہ یقین دلا رہی تھی جس پر اس نے پہلی نظر ہی شک کی ڈالی تھی اور ابھی تک اس پر قائم بھی تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

*_*_*

وہ تو دو دن کے بعد واپس چلا گیا۔ حنیٰ البتہ وہیں رہ گئی اور اب کے تو اس نے دل میں فیصلہ کیا ہوا تھا کہ اس قید خانے میں دوبارہ نہیں جائے گی اس کا چاہے رونا بھی رہنے کے لیے آ گئی بڑے اچھے دن گزرنے لگے۔ تقریباً ایک ماہ ایسے ہی گزر گیا پھر ابو اس سے ملنے کے لیے آئے تو وہ بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس دوران عادل کے فون آئے تو وہ صرف ممانی سے یا بلال اور ہادیہ سے بات کر لیتا ماموں سے ناراضی ہنوز برقرار تھی اور حنیٰ کو وہ بھلا کس کھاتے میں شمار کرتا تھا جو اس سے بات کرتا۔

امی کی طرف آ کر اس نے سارے شکوے دل میں دفن کر لیے۔ وہ لمحے اذیت کے جو گزر چکے تھے وہ چاہتی بھی تو ان کی شدت کا احساس کسی کو نہیں دلا سکتی تھی اور یوں بھی اہمیت تو حال کی ہوتی ہے موجود لمحے کا ماضی تو ماضی ہی ہوتا ہے چاہے کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو۔ اس کا سوگ حال میں بہت دیر تک نہیں منایا جا سکتا۔

پھر دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ امی پوچھ پوچھ کر تھک گئیں۔ اس کا ایک ہی جواب تھا۔ میں نہیں جاؤں گی اور کس لیے جاتی بھلا۔ اسی تنہائی اور جبر کی چکی میں پسنے کے لیے اور اس نے کون سا اس کی خیر خبر لی تھی۔ حنیٰ نے اس سے وابستہ ہر امید کا گلا گھونٹ دیا تھا ماموں ممانی دوبارہ ملنے آئے۔ اسے ساتھ چلنے کو بھی کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ سارے خاندان میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں مگر اس نے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ امی کے کہنے پر آپی نے اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی امی ابو کی پریشانی کا احساس دلایا تو اس نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا کہ اگر عادل اسے لینے آئے گا تو چلی جائے گی۔ سب نے اسے اس کے حال

پر چھوڑ دیا۔

اکتوبر کے بعد نومبر اور پھر دسمبر آگیا۔ شدید سردی کی لہر آئی تھی۔ سارے درخت ٹنڈ منڈ ہو گئے تھے جیسے ساری رونقیں ختم ہو گئی تھیں۔ ساری فضا میں اداسی رچی ہوئی تھی اور یہی عالم اس کے اندر تھا۔ ثنا کا بہت بولنا بھی اب اسے پریشان نہیں کرتا تھا۔ لگتا تھا جیسے زندگی ٹھہر گئی ہے۔ سارے سال آکر ختم ہو گئے ہیں۔ ایک ہوا اس کے گھر میں چلتے جا رہے تھے اور وہ ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

آج 31 دسمبر تھا۔ ایک تکلیفوں بھرے سال کا آخری دن۔ اس سے اگلے دن خاور نے امریکہ جانا تھا۔ اسے پاکستان آئے ہوئے چھ ماہ ہو چلے تھے خاور کے ساتھ اس کی دوستی بڑی پالی تھی۔ گھر بھی زیادہ دور نہ تھے۔ خاور کی شادی اس کی شادی سے کچھ ماہ پہلے ہوئی تھی اور جب عدیل کی تو بہت بکھری ہوئی تھی۔ خاور سے کچھ بھی نہ چھپا سکی۔ سب کچھ اسے بتا دیا۔ وہ بھی نہ سمجھ سکی کہ آخر عادل کی خفگی کا سبب کیا ہے؟ اور ثنی نے تو اس بات پر سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یوں بھی خاور کی سنگت میں سب کچھ بھول جایا کرتی تھی۔ خاور کی وجہ سے اس کی ڈھارس بندھی ہوئی تھی اور اب کل اس کی واپسی تھی۔ وہ آج صبح ہی سے اس کی طرف چلی گئی تھی۔ دونوں نے جی بھر کر باتیں کیں۔ خاور نے اسے بڑا دلاسا دیا کہ اس کا صبر رائیگاں نہیں جائے گا۔ یقین تو پہلے سے بھی تھا مگر اب اس کا یہ یقین بھی ڈانواڈول ہو چکا تھا۔

*_*_*

اس نے صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسے اپنے اوپر کتنا اختیار ہے کتنے مہینے تنہا گزار دیے۔ وحدت سے بھی ملتا مگر اس [illegible] لیے عادل کے دل میں کسی قسم کے [illegible] تھے۔ [illegible] دوستی کی [illegible] کی برائی [illegible] موضوعات پر دونوں کے خیالات ملتے جلتے تھے پھر وحدت کے مزاج کو بڑی اچھی طرح سے سمجھتا تھا اور وہ اسے تو سمجھتی ہی تھی۔ [illegible] بھی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی بلکہ اس نے وحدت پر یہ ظاہر کیا تھا [illegible] کم کی نسبت [illegible]

وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔

ثنی کے جانے سے اس کے جذبوں کو ٹھیس ہوئی تھی مگر جب عادل نے صاف لفظوں میں [illegible] بتا دیا تو اس نے بھی اپنا راستہ بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ شعیب کے ساتھ شادی کی ہامی بھر لی۔ وہ اس کا فیلو رہ چکا تھا اور ایک عرصے سے اس کے ایک اشارے کا منتظر تھا مگر اس کے کمزور فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ممانی نے اسے کبھی در خور اعتنا نہیں سمجھا تھا مگر اب وحدت نے بھی بہتر سمجھا کہ اس کا ہاتھ تھام لے جو اسے دل و جان سے چاہتا ہے کیونکہ جب وقت کی گاڑی گزر جاتی ہے تو پھر پیچھے رہ جانے والے مسافروں کے پاس سوائے ملال کے اور کچھ نہیں بچتا۔ عادل نے شادی کے سارے انتظامات کیے تھے۔ اس طرح اس نے ماموں سے کیے گئے وعدے کو نبھایا کہ وہ ان کے بعد وحدت کا خیال رکھے گا۔ یہ بوجھ سے اترا تو اس کے دن رات کے اصرار کے بعد اس نے سوچنا شروع کیا اگرچہ یہ سوچ تو اس کے ذہن سے ایک پل کے لیے بھی دور نہ ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے ثنی سے کوئی بھول ہو گئی ہو اور اب وہ اس پر نادم بھی ہو لیکن پھر اس دن فون پر ثنا نے جب خاور کا بتایا تو ثنی کی بے قراری یاد آتے ہی اس کا خون نئے سرے سے کھولنے لگا۔

پھر اس نے ثنی کی کمزوری اس کی خطا کو معاف کرنے کے لیے اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسے ایک موقع ضرور ملنا چاہیے یہ فیصلہ کرتے کرتے دسمبر کی آخری تاریخ آ گئی۔

وہ دس بجے کے قریب پھپھو کے گھر پہنچا۔ وہ دن اگرچہ سال کے چھوٹے ترین دنوں میں سے تھا مگر نہیں کیوں اسے یہ دن بڑا بڑا اور روشن لگ رہا تھا۔ بعض دن اپنے آگے پیچھے کے دنوں سے بڑے جدا اور منفرد ہوتے ہیں ان کی انفرادیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سارے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ پھپھو تخت پر آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی تھیں۔ اس کے سلام کی آواز پر ایکدم سے اٹھ بیٹھیں۔ [illegible] تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ [illegible]

کر خاموش آنسوؤں سے روتی رہیں۔ اسے دکھ ہوا کہ اس کی وجہ سے اتنے پیارے رشتوں کا دل دکھا ہے۔ ثنا کچن سے نکل کر آئی اور حسب عادت بڑی [illegible] علی جواد بھی آ گیا مگر وہ نظر نہ آئی جو ان پانچ دن [illegible] ایک پل کو بھی اس کی نظروں کے سامنے سے نہ ہٹ سکی تھی۔ اس کی ساری انا اس کے تصور کے آگے ڈھیر ہو جاتی۔ وہ انا کی اس گیلی لکڑی کو پھر سلگانے لگا تو دھوئیں سے اس کی آنکھیں بھر جاتیں۔ پھپھو کے کہنے پر ثنا نے کھانا لگایا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔

"جاؤ جواد! تم ثنی کو جا کر لے آؤ۔" کافی دیر بعد پھپھو کو خیال آیا۔

"ثنی کہاں گئی ہوئی ہے؟" اس نے دل کڑا کر کے پوچھ ہی لیا۔

"خاور کی طرف، یہاں نزدیک ہی ہے گھر، میں لے آتا ہوں۔" جواد کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"چلو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ کھانا بھی ہضم ہو جائے گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آج یہ معمہ بھی حل ہو ہی جائے کہ آخر یہ کون موصوف ہیں جن سے یہ اتنے دھڑلے سے ملتی ہے۔

"اللہ عادل بھائی! آپ سے صبر نہیں ہو رہا۔ اچھا ابھی میں بھی ساتھ جا رہی ہوں خاور سے بھی مل آؤں گی۔" ثنا جلدی سے دوپٹا سر پہ پھیلاتے ہوئے بولی۔

جانے کے لیے انہوں نے پچھلا رستہ اختیار کیا۔ تنگ سی گلی کے آگے سڑک تھی اور اس کے سامنے ہی لمبی سی کشادہ گلی تھی۔ دونوں بہن بھائی سارا راستہ باتیں کرتے گئے وہ بھی ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ گلی کے دائیں طرف پانچواں سفید گیٹ والا گھر تھا۔ جواد نے بیل دی تو ثنا کی ہم عمر لڑکی نے دروازہ کھولا۔

"اوہو! آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں آئیں اندر آئیں۔" وہ خوش دلی سے ثنا سے ہاتھ ملاتے ہوئے انہیں راستہ دینے لگی۔

"نعمان! یہ ثنی کے ہسبینڈ ہیں عادل بھائی۔" ثنا نے تعارف کرایا۔

"نعمان؟ لڑکی کا نام۔" عادل نے پہلی بار سنا تھا وہ

پھر چونک سا گیا۔

اس نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ "میں بلاتی ہوں انہیں۔" کہتی ہوئی ثنا بھی اس کے ساتھ ہی نکل گئی۔

چند لمحوں بعد ہی ڈرائنگ روم کے باہر سرگوشیوں کی آواز آنے لگی۔

"دیکھا میں نے کہا نہیں تھا تمہارا صبر انہیں کچے دھاگے سے باندھ کر لے آئے گا۔" نسوانی آواز اجنبی تھی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" ثنی کی دبی دبی آواز آئی۔

"اوفوہ! تم تو یوں شرما رہی ہو جیسے وہ تمہارے شوہر نہ ہوں۔ تمہارے منگیتر ہوں۔ اور میرا تعارف تو کروا دو کم از کم۔" وہی آواز آئی۔

"ان سے ابھی تک میرا تعارف نہیں ہو سکا۔ تمہارا کیا کرواؤں۔" ثنی کی تلخ آواز ابھری۔

پھر شاید پیچھے سے کسی نے اسے دھکا دیا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک اور ہنستا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ قریب تھا کہ خاور نے اسے

دینی کافی اور آگے کو دھکیلا۔ صنی نے بظاہر بہترین
دکھتے عادل کو دور سے سلام کیا اور صوفے کی پشت
پر ہاتھ رکھ کر کھڑی رہی۔
"ہم سب میرا خیال ہے۔ یہ تو تعارف کروائے گی
نہیں میرا نام خاور ہے۔ میں اس کی بہن سمجھ لیں
لڑکیوں کی دوست ہوں۔ میری شادی چونکہ اس سے
پہلے ہو گئی تھی اس لیے میں آپ کی شادی میں شریک
نہ ہو سکی ورنہ ہمارا تعارف پہلے ہو جاتا۔"
وہ اس کے قریبی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
پہلے ملنے کا ملال خاور کو نہیں ہوگا۔ جتنا عادل کے
دل میں ملال تھا۔ کاش یہ تعارف شادی پر ہو
جاتا۔ اس کی چہکتی ہوئی آواز نے عادل کے ذہن سے
منوں بوجھ اتار دیا اور اب وہ کھل کر مسکرا رہا تھا۔
بات تو اس کے سمجھ میں بھی آ گئی کہ خاور کوئی
لڑکی ہوگی اور ریحان جن لڑکیوں کی دوست ہوگی ان
کے منگیتروں اور شوہروں کے ساتھ کیسی گزرتی ہو
گی۔ اس کا اندازہ اسے بخوبی ہو رہا تھا۔

دونوں بہنیں بڑی باتونی اور خوش مزاج تھیں۔
انہیں چائے بغیر پیئے ہی نہ دیا۔ پھر جانے سے پہلے ہی وہ
اٹھ کھڑے ہوئے کہ شائستہ گھر میں اکیلی تھیں۔
دینے پر اصرار، "اپنے شوہر کو بڑی چھپا کر رکھنے والی
نکلی ہے اور تم اتنے مہینوں سے اسے ملنا چھوڑے
بیٹھی ہو۔" اس نے نکلتے نکلتے صنی کے کان میں
خاور کو سرگوشی کرتے سنا۔ پھر وہ خدا حافظ کہہ کر باہر
نکل آئے۔

دھوپ ڈھل چکی تھی اور سورج اپنے سفر کے
اختتام پر تھا۔ فضا ایک دم سے خوشگوار ہو گئی تھی۔ ہر
منظر سہانا نظر آ رہا تھا۔
"یار یہ عجیب بات نہیں کہ لڑکیوں کے نام
خاور اور ریحان۔" اس نے باہر نکل کر جواد سے کہا۔
"ہاں شروع شروع میں سب کنفیوز ہو جاتے ہیں۔ ہم
تو شروع میں بھی خاور صاحب کہہ کر چھیڑا کرتے
تھے۔ اصل میں [illegible] ان کی امی کو بیٹے کی
تمنا تھی اس لیے انہوں نے چاروں کے نام لڑکوں
جیسے رکھے جس کا اثر یہ ہوا کہ پانچویں اولاد لڑکا تھا۔" جواد
نے تفصیلاً جواب دیا۔
"اچھا۔ یہ تو پھر کوئی ٹوٹکا ہوا۔"
ثنا اور صنی سست قدموں سے پیچھے پیچھے آ رہی
تھیں۔
"تم لوگ تیز قدم اٹھاؤ۔ شام ہو رہی ہے۔ امی
پریشان ہو رہی ہوں گی۔" جواد نے پیچھے مڑ کر کہا۔
"جواد! صنی کو جوتا کاٹ رہا ہے۔ ابھی اس نے
کل ہی تو لیا تھا۔ ویسے اس بیچاری کے ساتھ یہ بڑی
ٹریجڈی ہے۔ ہر اہم موقع پر اسے جوتا کاٹنے لگتا ہے۔
پتا ہے عادل بھائی! جس دن صنی کا نکاح تھا۔ اس روز
اس نے آپی کا جوتا پہنا تھا جو اسے چھوٹا تھا۔ دونوں
پاؤں زخمی ہو گئے اور جب یہ اسٹیج پر پہنچ کر تیزی سے
آپ کی طرف بڑھی تو ہم سمجھے آپ فرط جذبات سے
مغلوب ہو کر آپ سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہی
ہے۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ محترمہ کو جوتا کاٹ رہا تھا
ساری مووی میں اس کی روتی شکل دیکھ کر سب کہہ
رہے تھے صنی تمہیں عادل بھائی کیا سوئیاں چبھو
رہے تھے جو تم نے اس قدر تکلیف دہ پوز دیا
تھا۔" صنی نے زور سے ثنا کے چٹکی کاٹی تو اس کے
منہ سے چیخ نکل گئی۔ ثنا کے بہت بولنے کی عادت آج
عادل کو بہت اچھی لگی۔
"اس کے پاؤں بڑے نازک ہیں۔" وہ پھر بولی۔
"اچھا چلو! مجھ سے نہیں چلا جا رہا۔ میں جوتے اتار
رہی ہوں۔ ثنا میرا ہاتھ تو پکڑو، سڑک کراس کرتے
وہ جیسے تکلیف سے دہری ہوتی ہوئی بولی۔
"لاؤ میں پکڑ لیتا ہوں۔" عادل تیزی سے اس کا
ہاتھ تھامنے کے لیے آگے بڑھا۔
اس نے غصے سے اسے دیکھا اور تیزی سے دو قدم
اٹھا کر آگے بڑھی اور جواد کا بازو تھام کر چلنے لگی۔

*_*_*

31 دسمبر 1998ء
آج سال کا آخری دن ہے۔ جذباتی مدوجزر
ملتی میرے لیے غلط فہمی اور حماقتوں کا سال۔ میں
نے کبھی ڈائری نہیں لکھی مگر آج زندگی میں پہلی بار
جی چاہ رہا ہے کہ میں کسی سے باتیں کروں۔ وہ
باتیں جو میں کسی سے بھی نہیں کر سکتا حتیٰ کہ
خود سے بھی نہیں۔ اگر کسی کو پتا چل جائے کہ پورے
دو سال میں نے کس حماقت کی نذر کیے ہیں تو شاید وہ یہ
سمجھ بیٹھے کہ دنیا کے سارے مرد اتنے ہی بے وقوف
ہوتے ہیں جتنا کہ میں اس لیے یہ سارے مردوں کی
ناک کا مسئلہ بھی ہے کہ میں اس بات کی اسے ہوا بھی
نہ لگنے دوں۔
وہ مجھ سے بہت خفا ہے۔ جب سے آیا ہوں۔ اس
کے چہرے کے تاثرات اس قسم کے ہیں کہ اسے
میری صورت سے بھی نفرت ہے۔ اگر پھوپھو کا لحاظ نہ
ہوتا تو شاید وہ مجھے دھکے دے کر نکال دیتی۔ اس کی خفگی
بجا ہے۔ جس ناکردہ جرم کی سزا اس نے جھیلی ہے اس
کے مقابلے میں یہ خفگی بہت کم ہے۔ مجھے اس کی تلافی
کرنا ہے مگر آج کی رات محاسبے کی رات ہے۔
ہم جو ہمیشہ دوسروں پر تنقید کرتے ہیں دوسروں
کے رویے اور ان کی سوچوں سے اپنی مرضی کے نتائج
اخذ کرنے میں زندگی کا زیادہ حصہ گزارتے ہیں کبھی یہ
کیوں نہیں سوچتے کہ ہم خود کیا ہیں؟ ہمارے اندر
کتنے غلط رویے پروان چڑھ رہے ہیں اور ہمیں ان کی
خبر بھی نہیں۔ ہم اپنی خامیوں کو خوردبین سے دیکھتے
ہیں اور دوسروں کی ٹیلی اسکوپ سے اور اپنی خوبیوں کے
لیے ہم ٹیلی اسکوپ استعمال کرتے ہیں جس سے وہ
ہمیں خوب بڑی بڑی نظر آتی ہیں۔ ہم نے اپنے اندر
جالے بنا رکھے ہیں اپنے لیے الگ دوسروں کے لیے
الگ۔ ہم شعوری اور لاشعوری طور پر خود پسندی کا
شکار ہیں اور اسی رستے پر آنکھیں بند کیے چلے جاتے
ہیں۔ آج مجھے شیکسپیئر کے ڈرامے Night
Twelfth کا کردار Malvolio یاد آ رہا ہے۔ جو خود
پسندی کی جنت میں رہتا ہے دوسروں سے بدگمان۔ وہ
ان لوگوں میں سے ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ نا صرف
انہیں اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق دیا جائے
بلکہ وہ دوسروں کو بھی اپنی مرضی کے مطابق مجبور کر
سکیں۔
پورے دو سال میں نے ایک ذرا سی غلط فہمی کی
بھینٹ چڑھا دیے۔ اس کی ایک بات سنی اور فیصلہ
صادر کر دیا۔ سارے غلط کو شواہد سے اس کے کھاتے
میں ڈال دیے اور اپنے میزان کا پلڑا سب سے اونچا
رکھا۔ کبھی پلٹ کر تصدیق یا ترمیم کی کوشش نہیں کی۔
اللہ کی سچی کتاب کی ہر بات سچی ہے کہ "بے شک
انسان عجلت پسند ہے۔ بڑی جلدی فیصلے کر لیتا ہے۔
اور اے ایمان والو! بدگمانی سے بچو اور بلا تحقیق کسی
بات پر یقین مت کر لیا کرو۔" میں نے ایک شام کی بنیاد
پر بدگمانی کی ایک پوری عمارت کھڑی کر لی۔ سوچتا ہوں
تو شرم آتی ہے میں جو اپنے دوستوں احباب میں سب
سے سمجھ دار اور بااصول سمجھا جاتا تھا۔ اندر سے اتنا
بودا اور کمزور نکلا۔ انا کا مارا ہوا مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ
اس سے فقط اتنا ہی پوچھ لوں کہ خاور کون ہے؟
پھوپھو کے کہنے کے باوجود وہ اوپر نہیں آئی اور میں
اس سرد رات میں انتظار کے دیپ جلائے آدھی
رات تک اس کی راہ تکتا رہا۔ یقیناً میں اسی سلوک کا
مستحق ہوں۔ لیکن پھر بھی اس نے تو سوا سال کی سزا
کاٹی ہے جبکہ میں تو اس عذاب سے دو سال سے گزر
رہا ہوں۔ اس پر ظلم ہوا تو میں کون سا چین سے رہ سکا
ہوں جب ہم اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر
حرام کرتے ہیں تو یونہی خود ساختہ اذیتیں ہمارا گھیراؤ
کرتی ہیں۔ کفارہ تو ادا کرنا ہی ہوگا مگر یہ سبق میری
پوری زندگی کے لیے کافی ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے
اور کان جو کچھ سنتے ہیں وہ وہی کچھ نہیں ہوتا جو ہم
سمجھتے ہیں۔
رات بھیگ رہی ہے اور سردی بھی بہت ہو گئی
ہے۔ اس کے ساتھ ہی نیا سال نئی زندگی کی شروعات
لے کر آیا ہے۔ کم از کم میرے لیے ایک روشن صبح
منتظر ہے۔ اب مجھے سو جانا چاہیے کہ کل سفر بھی کرنا
ہے اور مجھے یقین ہے کہ واپسی کا سفر بہت خوشگوار ہو
گا۔

★